R. No. 9186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29

Annual Rs. 5/-

per Copy-15 P.

جلد۲۷- شمارہ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۸ جون ۱۹۶۸ء

اداریہ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ

(۲)

ابتدائی اور ثانوی تعلیم اقلیتوں کی زبان میں دینے کے لیے اساتذہ کی مسلسل تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ ریاستی حکومتوں میں اس حقیقت کا پورا احساس نہیں ہے۔ اترپردیش کی حکومت نے یہ تو کہہ دیا کہ اردو میڈیم اسکولوں کے لیے کوئی استاد اسی صورت میں مقرر کیا جا سکے گا۔ جب وہ اردو میں مناسب صلاحیت رکھتا ہو اور ہندی بھی جانتا ہو۔ مگر کمشنر کا یہ فقرہ اس سلسلے میں خاص توجہ کا محتاج ہے "اترپردیش میں اقلیتوں کی زبانوں میں استادوں کی تربیت کے لیے کسی قسم کی سہولتیں نہیں ہیں" اس سے زیادہ بلیغ تبصرہ ریاستی حکومت کے رویے پر اور کیا ہو گا۔ کچھ ریاستی حکومتوں نے یہ عذر کیا ہے کہ اقلیتی زبانوں کے استادوں کے لیے علیحدہ تربیتی اداروں کی کیا ضرورت ہے کیونکہ تربیت کا نصاب تو یکساں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عام تربیتی اداروں میں ان استادوں کی تربیت کے ساتھ اقلیتی زبانوں میں تعلیم کی تربیت کا بھی انتظام ہو تو کوئی حرج نہیں، مگر یہ انتظام بھی نہ ہو اور مخصوص ادارے بھی اس غرض سے نہ کھولے جائیں۔ یہی چیز اقلیتوں کو خاص طور پر تکلیف دیتی ہے۔ کمشنر کو اس ضرورت کا پورا احساس ہے اور وہ برابر ریاستی حکومتوں کو توجہ دلاتے رہتے ہیں

اترپردیش کی حکومت کو جب انجمن نے توجہ دلائی کہ ہائی اسکول کے امتحان میں طلبہ اردو میں جوابات نہیں لکھ سکتے گو کاغذ پر اس کی اجازت ہے تو حکومت نے کہا کہ اس اجازت سے جو فائدہ اٹھانا چاہے اٹھا سکتا ہے مگر کمشنر کی آٹھویں رپورٹ میں اصل حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ صفحہ ۹۵ پر تعلیمی اعداد و شمار کے عنوان کے تحت کمشنر نے لکھا ہے کہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن اترپردیش کے بورڈ نے جو قواعد وضع کیے ہیں ان میں ثانوی تعلیم اقلیتوں کی زبان کے ذریعہ سے دینے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی تعلیم کے لیے تو سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی طالب علم صرف جوابات اردو میں دینے کے لیے درخواست کرتا ہے تو ایک دوسرے قاعدے کے تحت اسے صرف اس وقت اجازت دی جا سکتی ہے جب اس نے ہندی کے ذریعہ سے پڑھنے کے بجائے اردو کے ذریعہ سے پڑھا ہو۔ یعنی اردو کے ذریعہ سے طالب علم پڑھ نہیں سکتا اور چونکہ اردو میں پڑھنے کا اسے موقع نہیں ملا اس لیے اجازت جو جوابات اردو میں لکھنے کے لیے ہے۔ مناسب فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ کاغذ پر یہ ہدایت باقی رہ گئی کہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کو خصوصی طور سے اجازت دینے کا اختیار ہے اس میں ترمیم کے لیے ریاستی حکومت تیار نہیں ہے۔ صفحہ ۹۵

جہاں تک لسانی اقلیتوں کی شکایات کا سوال ہے کمشنر نے ہر شکایت کے موصول ہونے پر ریاستی حکومتوں کو توجہ دلائی ہے کچھ ریاستی حکومتوں نے بعض شکایات کو دور کرنے کے لیے احکام بھی جاری کیے ہیں۔ مگر اترپردیش کی حکومت اپنی وضع پر بڑی حد تک قائم ہے۔ اقلیتی زبانوں کے سرکاری کاموں میں استعمال کا جہاں تک سوال ہے۔ کمشنر نے کہا تھا کہ ریاستوں کی نئی تنظیم کی کمیٹی کی سفارشات اور بڑے وزیروں کی کانفرنس کی سفارشات کی روشنی میں ان تحصیلوں یا میونسپلٹیوں میں جہاں لسانی اقلیت کل آبادی کی پندرہ سے بیس فیصد ہے اقلیت کی زبان میں تمام اہم قواعد و قوانین شائع ہونے چاہئیں مگر ریاستی حکومت ضلع کو ایک انتظامی اکائی مانتی ہے اور اس سے نیچے اترنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کمشنر نے پھر اپنی سفارش دہرائی ہے کہ اقلیتوں کو یہ سہولت ملنی چاہیے صفحہ ۔ ابھی حال میں اترپردیش کی حکومت نے

کچھ اور تحصیلوں میں خاص خاص قوانین کی پبلسٹی کرنے کے لیے احکام جاری کئے ہیں۔ مگر قوانین کے خلاصے سے کام نہیں چلتا۔ پبلک کے سامنے پورا قانون یا اعلان ہونا چاہیے۔

کمشنر نے ریاستی حکومتوں کو اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اقلیتی زبانوں میں عرضیاں لی جائیں اور ان کے جوابات بھی اسی زبان میں دئے جائیں۔ بیشتر ریاستی حکومتوں نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور اترپردیش کی حکومت نے بھی مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ واقعی ہر عرضی کا جواب اسی زبان (اردو) میں دیا جاتا ہے یا نہیں۔ کمشنر نے اترپردیش کی حکومت کو اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ جب پارلیمنٹ کی روداد اردو میں، تقریریں اردو رسم خط میں چھپتی ہیں تو اترپردیش کی مجلس قانون ساز کی وہ تقریریں جو اردو میں کی جاتی ہیں اردو میں کیوں نہیں چھاپی جاسکتیں؟ مگر ریاستی حکومت اپنی سرکاری زبان ہندی کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے ایسا کرنے کو تیار نہیں ہے، وہ تو اردو اور ہندی میں کوئی بنیادی فرق ہی نہیں سمجھتی۔ کمشنر نے اس سلسلے میں پھر یاددہانی ضروری سمجھی ہے (ص [illegible]) سمن اور عدالتی نوٹس کے متعلق ریاستی حکومت کا صاف انکار ہے (ص [illegible])

مقابلے کے امتحانوں میں لازمی ہندی کے پرچے کے سلسلے میں کمشنر [illegible] دفعہ توجہ دلا چکا ہے۔ اب بھی کمشنر کو کہنا پڑا ہے کہ اس معاملے میں حکومت کے عمل کا ابھی علم نہیں (ص ۹۲)۔ یہ معاملہ سنٹرل زونل کونسل میں بھی آچکا ہے اور ریاستی حکومتوں کے نمائندے یہ وعدہ کرچکے ہیں کہ وہ اپنے طریقۂ کار پر نظرثانی کریں گے مگر ابھی تک کچھ نہیں ہوا ہے۔

کمشنر نے خاص طور پر اس بات پر افسوس کیا ہے کہ اقلیتوں کی شکایات کی تحقیقات اور ان پر مناسب کارروائی میں ریاستی حکومتیں بہت "تاخیر سے کام لیتی ہیں" (ص ۱۱۳)۔ اگر ان معاملات میں پھرتی سے کام لیا جائے اور جہاں کارروائی ضروری ہو، فوراً کی جائے تو وہ بددلی اور مایوسی جو اقلیتوں میں ہے، ضرور کم ہو سکتی ہے۔ اب پارلیمنٹ اور صدر جمہوریہ دونوں کا یہ فرض ہے کہ کمشنر کی رائے کی روشنی میں اس تاخیر اور تساہل کو دور کرائیں۔ کمشنر نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

فاروق دیوانہ کا انتقال

علی گڑھ۔ یہ خبر نہایت رنج سے سنی جائے گی کہ ۳۰ مئی کو گورکھپور میں فاروق دیوانہ کا انتقال ہوگیا۔ فالج کے حملہ کے باعث عرصہ سے علیل تھے۔ ریاضی کے علاوہ عربی فارسی اردو ادب پر گہری نگاہ تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد میں کام کرنے کے علاوہ ایم اے او کالج میں ریاضی کے استاد بھی رہ چکے تھے۔

شمس طہرانی

محمد فاروق دیوانہ مرحوم

وہ فاروق وہ مردِ عظمت نشاں
خلافت کی تحریک کا رازداں
وہ جس کے ثنا خواں بہ حسن جلی
محمد علیؒ اور شوکت علیؒ
وہ علم و ادب کا نشانِ جلیل
بہ دل رودِ کوثر، بہ جاں جبرئیل
سراپا محبت، مجسم وفا
خلوص و شرافت کا وہ دیوتا
ریاضی صداقت کی تفسیر تھا
حقیقت پسندی کی تصویر تھا
علی گڑھ نے آگے بڑھایا جسے
وطن نے گلے سے لگایا جسے
وہ صد حیف دنیا سے اب چل بسا
کہ روتی ہے قوم جس کے غم میں فضا
چو دیوانہ شد سوئے دارِ رفیق
قضا گفت "بادا برحمت غریق"

۱۹۷۸ء

فاروق بانسپاری کی وفات

کانپور ۲ جون۔ بلتھرا روڈ ضلع بلیا سے ایک اطلاع مظہر ہے کہ ۲۹ مئی کی شب میں فاروق بانسپاری کی وفات ہوئی۔ فاروق صاحب شاعر، ادیب، صحافی اور بڑے مخلص، نیک سیرت اور خدا ترس انسان تھے۔ (ریاست)

نذرالاسلام کی سوانح حیات

نئی دہلی۔ انقلابی شاعر نذرالاسلام کی ۷۹ ویں سالگرہ کے موقعہ پر نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے ان کی سوانح حیات انگریزی میں شائع کی گئی ہے۔ اب اس کتاب کا ترجمہ تمام ہندوستانی زبانوں میں ہوگا۔ یہ سوانح حیات ایک ممتاز صحافی جناب بسودھا چکرورتی نے ترتیب دی ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں قاضی نذرالاسلام نے انتہائی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

عمر خیام کی ۹۲۰ ویں سالگرہ

سمرقند۔ فارسی کے مشہور شاعر عمر خیام کا ۹۲۰ واں جنم دن وسطی ایشیا کے متعدد شہروں میں خصوصاً سمرقند میں دھوم دھام سے منایا گیا۔ (الجمعیۃ)

تحریر: احمد کسروی
مترجم: کبیر احمد جائسی (علیگ)

آذربائیجان کی قدیم زبان اور لوگ

(ایک زمانہ میں ترکی میں یہ تحریک چلی تھی کہ وہ ترک جو ترکی کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بس گئے ہیں ان سب کو متحد کرکے "عظیم ترک قوم" کی بنا ڈال جائے، اس سلسلہ میں ترکوں کی خاص نظر ایران کے صوبہ آذربائیجان پر تھی جہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے۔ ترکوں کی اس کوشش نے ایرانیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہاں کا دانشمند طبقہ علمی اور لسانی حیثیت سے اس تحقیق پر آمادہ ہوا کہ اس دعویٰ کی اصل کیا ہے؟ ایک ایرانی فاضل احمد کسروی مرحوم نے اس موضوع پر ایک کتابچہ تصنیف کیا جس کا نام "آذری یا زبان باستان آذربائیجان" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ترکوں کے دعوے کی علمی انداز سے تردید کی ہے۔ زیر نظر مقالہ اسی کتاب کے باب اول کا آزاد ترجمہ ہے۔ اگر قارئین نے اس سلسلہ کو پسند کیا تو مذکورہ کتاب کے دوسرے ابواب کا بھی ترجمہ ہماری زبان میں پیش کیا جائے گا۔ مترجم)

وہ تاریخ داں جو ان علمی کوشش سے واقف ہیں جن کے گرانبہا نتائج نے تاریخ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے، یہ جانتے ہیں کہ اب سے تین یا چار ہزار سال پہلے ایک قوم کے لوگ جس کا نام آریان یا ایران (ERAN) تھا اپنے مسکن سے کوچ کرکے ایشیا اور یورپ میں بس گئے ان میں سے ہر گروہ جہاں بھی پہنچا اور جس سرزمین کو بھی اپنا وطن بنایا وہاں کے لوگوں پر غالب آیا اور اپنی حکومت قائم کی اس طرح انھوں نے تاریخ کی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔ جیسے یونانی اور رومی، جنھوں نے یورپین تہذیب کی بنیاد ڈالی اور انھوں نے تاریخ کی دنیا میں اپنی جگہ پیدا کی اور جرمن کہ انھوں نے مغربی روم کو فتح کیا اور اپنے جوش میں انھوں نے تاریخ یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، یہ سب لوگ آریان یا ایرانی (ERANI) تھے اسی طرح وہ لوگ جو ایران (ERAN) کے پہنچتے تک پہونچے اور اس کو اپنا وطن بنا لیا ان میں سے تین خاندانوں نے جو ماد، پارت اور فارس کے نام سے مشہور ہیں اپنی اپنی باری پر حکومتیں قائم کیں، یہ سب کی سب حکومتیں عظیم ترین اور کامیاب ترین ایشیائی حکومتیں تھیں۔

اگرچہ ان لوگوں کا اپنے مسکن سے کوچ کرنا اور یورپ میں پھیل جانا زمانہ ماقبل تاریخ میں واقع ہوا تھا اور اس زمانے کی کوئی تحریر ہمارے پاس نہیں ہے لیکن وہ اشارے جو اس بارے میں اوستا وغیرہ میں ہیں اور وہ علمی کوششیں جو اس سلسلہ میں ہوئی ہیں ان سب نے اس بات کو روشن اور واضح کردیا ہے۔

آج ہم اس بات کو خوبی جانتے ہیں کہ آریان یا ایران اپنے کوچ سے پہلے قطب شمالی کے برفستان کی طرف رہتے تھے جس کو اوستا میں "آئریا دیجو" کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ وہاں دس ماہ تک جاڑا رہتا ہے اور صرف دو ماہ گرمی رہتی ہے۔

یہ باتیں تاریخ میں واضح ہیں اور ان پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے کہ ایران یا آریہ کے لوگ جب پشتہ ایران تک آئے تو ان میں سے ایک بڑے خاندان نے جس کو ماد کہا جاتا ہے شمالی مغربی ایران پر قبضہ کیا جس میں آجکل آذربائیجان، ہمدان، کرمانشاہان، قزوین، اصفہان اور تہران کے شہر ہیں، اور یہ سرزمین ان کی نسبت سے سرزمین ماد کہی جاتی ہے۔ جس میں سے آذربائیجان کو "ماد خورد" اور دوسرے حصے کو "ماد بزرگ" کہا جاتا تھا۔ وہ عظیم تاریخی کارنامے جو آل ماد نے انجام دیئے (آشوری حکومت کا خاتمہ اور سوریا اور ایشیائے کوچک تک پیش قدمی) ناقابل فراموش ہیں۔

پس جیسا کہ آپ حضرات نے دیکھا آذربائیجان آغاز تاریخ ہی سے لوگوں اور زبانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس پر بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایرانی جب یہاں آئے اور انھوں نے یہاں کے لوگوں کو مغلوب کیا تو دونوں نسلیں آپس میں مل گئیں لیکن یہ بات ہر جگہ ہوئی ہے اور ہم اس بات کے کہنے کے درپے نہیں ہیں کہ آذربائیجان کے لوگ صرف ایرانیوں سے مخلوط ہوئے اور دوسرے لوگوں سے بالکل مخلوط نہ ہوئے کیونکہ یہ بات لغو ہوگی اور ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرنا بھی عقلمندی کے خلاف ہوگا۔

ہم سچائی کی تلاش میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ جس طرح تھا اسی طرح پیش کریں اس لئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تین ہزار سال پہلے جو آغاز تاریخ کا زمانہ تھا اس زمانے میں آل ماد آذربائیجان اور اس کے اطراف میں آباد تھے، اور اگر کوئی شخص تاریخ سے واقف ہے تو یہ جانتا ہوگا کہ اب سے دو ہزار سال پہلے تک ترک وسط ایشیا میں رہتے تھے اس لئے کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی لغو ہے کہ آذربائیجان ترکوں کا اولین مسکن تھا اور اسی طرح کی باتوں سے کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا۔

اس سے قبل اس نسل اور قوم کے لئے جس کی ہم میں جو کچھ آتا لکھتا، توریت میں ایرانیوں کا تذکرہ عربوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مسعودی اور دوسرے مورخوں نے کردوں کو "بنی عامر" سے متعلق لکھا ہے لیکن یہ تمام باتیں لغو ہیں اور ان پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آج کے دور میں کسی نسل کے اصل تک پہونچنے کا خاص ذریعہ اس کی زبان شناسی کو سمجھتے ہیں۔

آذربایجان کے سلسلے میں اور باتوں کے علاوہ ایک عمدہ نمونہ ان کی قدیم زبان کا بھی ہمارے سامنے موجود ہے اور وہ اوستا ہے، کیونکہ حضرت زردشت جیسا کہ لوگوں نے لکھا ہے آذربایجان ہی میں پیدا ہوئے اور خود اوستا کی زبان یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ شمال میں پیدا ہوئی۔

یہ آغاز تاریخ اور آل ماد کے زمانے کی باتیں ہیں۔

جب ہم ہخامنشیوں، سکندر، سلوکیان، اشکانیان اور ساسانیان کے زمانے تک آتے ہیں اور ہر ایک دور پر غائر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آذربایجان پر ایسا کوئی حملہ نہیں ہوا جس سے وہاں کے لوگ مغلوب ہو کر مفتوح قوم کے تحت کش ہوئے۔

سکندر کے زمانے میں ضرور آذربایجان فتح ہوا جس کی نشانیاں وہاں کی زبان میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال خود لفظ "آذربایجان" ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس جگہ کو گذشتہ زمانے میں "ماد خرد" کہا جاتا تھا لیکن جب سکندر ایران آیا اور پورے ملک پر اس کا قبضہ ہو گیا تو آذربایجان کا ایک شخص "آتورپات" نامی اٹھا اور اس نے آذربایجان پر قبضہ کر لیا وہ جب تک زندہ رہا وہاں کی فرمانروائی کرتا رہا اسی وجہ سے بعد میں یہ سرزمین "آتورپاتکان" کے نام سے مشہور ہوئی اور یہ وہی لفظ ہے جو بگڑتے بگڑتے آذربایجان ہو گیا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آتورپات کے خاندان نے صدیوں تک بادشاہت کی اور سلوکیان و اشکانیان کے زمانے میں ان کی حکومت قائم تھی۔

اگرچہ اس لفظ آذربایجان کے بھی لوگوں نے عجیب عجیب معنی بیان کئے ہیں جیسے برہان قاطع یا دیگر کتابیں، لیکن ان کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب لایعنی ہے اور علم و دانش کے بازار میں اپنی کوئی وقعت نہیں رکھتا، بلاشبہ آذربایجان ایرانی نام ہے اور ہم نے اس کے معنی بارہا بیان بھی کئے ہیں۔

اشکانیوں کے زمانے میں ایران کے غربی علاقہ کی طرف ترکوں نے پیش قدمی کی اور ایران کے بہت نزدیک آگئے لیکن وہ فتح مندی و کامرانی جو اشکانیوں کے نام سے عبارت ہے اس بات کے ماننے میں سد راہ ہے کہ ترکوں کا کوئی دستہ ایران میں گھس آیا ہو چنانچہ تاریخوں میں بھی ہم کو اس طرح کی کوئی بات نہیں ملی۔

ساسانیوں کے زمانے میں بھی ترک ایران سے نزدیک تھے اور شمالی ایران اور قفقاز کی سمت سے ایرانیوں کے ہمسایہ ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس بات کا گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آذربایجان میں گھس آئے ہوں گے، ہاں البتہ تاریخ میں ہم ایسے لوگوں کی نشاندہی کر سکیں گے جن کو ساسانی بادشاہوں نے جنگ میں قید کرکے آذربایجان کے مختلف حصوں میں بسا دیا تھا۔ لیکن اس طرح کے لوگ خود ایرانیوں ہی میں گھل مل گئے اور ان کا اپنا کوئی وجود باقی نہ رہا۔

آذربایجان میں نہروں، شہروں اور پہاڑوں کے نام، ایک خاص چیز جو کسی نسل اور قوم کے لوگوں کی زبان اور سرزمین متعین کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے وہ ان کے شہروں، دریاؤں، نہروں، دیہاتوں کے پہاڑوں کے نام ہیں کیونکہ ان ناموں کو ہر شخص استعمال کرتا ہے اور کثرت استعمال سے ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگرچہ آج آذربایجان کے بہت سے نام ایسے ہیں جن کے معنی ہم کو ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں لیکن بلاشبہ یہ تمام کے تمام بامعنی الفاظ تھے اور جب ہم تحقیق کی رو سے ان ناموں کے معنی تلاش کرتے ہیں تو بیشتر جگہوں پر ہم کو کامیابی ہوتی ہے۔

اس بات کو بلا کسی بحث کے قبول کر لینا چاہئے کہ پہاڑوں، دریاؤں، نہروں، دیہاتوں اور شہروں کے جو نام رکھے گئے وہ ان لوگوں کی زبان کے الفاظ ہیں جنہوں نے ان کی بنا ڈالی اور یہ سب کے سب بامعنی الفاظ تھے اور آج بھی اسی نہج پر قائم ہیں جس نہج پر ان کے نام رکھے گئے تھے۔

اگر ہم آذربایجان کے دریاؤں، شہروں، دیہاتوں، نہروں اور پہاڑوں کے ناموں پر غور کریں تو بہت سے نام ہم کو ایسے ملیں گے جن کے معانی کا ہم کو علم نہیں ہے جیسے تبریز، خوئے، سلماس، اردبیل، ادیجویہ، میلادا، الوار، آستارا، لوجان، ارس، انزاب، اور اسی طرح کے دوسرے نام۔

دوسرے قسم کے وہ آذربایجانی الفاظ ہیں جن کو اگر ہم زبان شناسی کی کسوٹی پر کسیں تو ان کے معانی تک پہونچ سکتے ہیں مثلاً مرند، آذرولق، آرالان، بابان، گہرام رود، گرمارود، مراغہ، گیلاندرود، دیگان، کادرود، خارخا بازار اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ۔

تیسرے قسم کے وہ الفاظ ہیں جو بامعنی ہیں مثلاً سردرود، گرم رود، زرین رود، گلرود، روشن وزنہ، بستانسر، باکو وغیرہ

(باقی آئندہ)

طیب انصاری

روزنامہ پیام "حیدرآباد دکن"

روزنامہ پیام، حیدرآباد کی صحافتی اور ادبی زندگی میں نئی قدروں اور نئی باتوں کا پیامبر بن کر طلوع ہوا۔ اور اس نے اپنی بے باک ترجمانی اور جواں ہمتی سے زندگی کو بہار انقلاب سے دوچار کیا اور انقلاب کے زمانہ میں خود بیتوں کو سہارا بھی دیا اور سنبھالا بھی۔ حیدرآباد کے اخباروں میں پیام بھی ایک اخبار تھا لیکن منفرد دکھتا! اس کی اپنی انفرادیت تھی اور یکتائی بھی۔ اس کا دور حیدرآباد کی تہذیبی تو نہیں سیاسی زندگی کا بحرانی دور ہے اور یہ بحران کنگ کوٹھی کے اندر بھی اور کنگ کوٹھی کے باہر "دارالسلام" میں بھی پرورش پا رہا تھا۔ نعرہ تکبیر کے پرجوش نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے آزاد حیدرآباد کے ترانے گائے جانے لگے تھے۔ ایک طرف کنگ کوٹھی کے اندر مصالحت اور اپنی گدی کی حفاظت کی فضا تیار کی جا رہی تھی دوسری طرف "مجلس" نے دارالسلام میں آزاد حیدرآباد کی تحریک کو ہوا دی تھی اور عوام ہاتھ میں تلوار نہ ہونے کے باوجود آمادہ پیکار تھے مختصر حیدرآباد میں سیاسی بے اطمینانی اور بدحالی عام تھی۔ جنون اور جوش کے اس اندھے سیلاب کو "پیام" نے قومی رجحانات سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ کام مشکل تھا اور مشکلات سے دوچار ہونا بھی پڑا۔ اس کے نتیجہ میں روزنامہ "پیام" بھی مختلف ادوار میں بحرانی حالات سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ دراصل "پیام" کے خاص تصورات۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ اور اس زمانہ کے اخبارات مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دور کے سارے شمارے مکمل "تاریخ" تو نہیں ہیں لیکن اوراق تاریخ کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں قاضی عبدالغفار نے "پیام" کو جاری کیا۔ وہ قوم پرست مسلمان تھے اور محمد علی کے تربیت یافتہ بھی تھے۔ انھوں نے خلافت تحریک میں حصہ لے کر سیاست سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا جس زمانہ میں قاضی صاحب نے "پیام" کو جاری کیا اس وقت کی حیدرآبادی صحافت خاصی دل آویز تھی اور جنون خیز بھی! "پیام" نے اپنی علیحدہ راہ اختیار کی۔ متین اور سنجیدہ! سیاسی اعتدال پسند! کیونکہ قاضی صاحب خود بھی اعتدال پسند ادیب و صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ مگر ابتدائی دور میں "پیام" کو مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عوام کا بڑا طبقہ وقت اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر تو رہتا ہی ہے اور جو اس کے رہنما بھی کم ہیں اور کوتاہ نظر ہوں تو اور بھی برا حال ہوتا ہے چنانچہ حال بھی برا ہوا تاہم چند ایسے بھی لوگ تھے جو "غداری" کا طعنہ سن کر بھی مستقبل پر نظر گاڑے بیٹھے آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ سیدھی راہ پر چل رہے تھے "پیام" نے انھیں روشنی دکھائی۔ پیام کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا اور یہ حلقہ پھیلتا ہی گیا۔ اشاعت تیزی سے بڑھنے لگی۔

ایک طرف تو عوام کے جذبات سے سامنا کرنا تھا دوسری طرف خود حکومت وقت نے پریس پر مختلف پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ "پیام" پہلا اخبار تھا جس نے صحافت کی آزادی کے لئے آواز بلند کی۔ قاضی صاحب نے صرف اخبار کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ حیدرآباد کے اخبار نویسوں کی انجمن کی بنا ڈال کر

علیم اختر

غزل

یہ شب کی پیٹھ میں سورج کا وار لگتا ہے
بکھر رہی ہے کرن، کوئی خواب ٹوٹا ہے

کبھی خوشی کے بدن پر بھی رینگ جاتا ہے
وہ دل کے کونے میں جو یاد کا سپولا ہے

یہ کیا ہے؟ سوچ رہے ہیں پرندے شاخوں پر
سحر ہوئی بھی نہیں ہے شفق اجالا ہے

یہ مانا، تم نہیں قاتل کہ لوگ کہتے ہیں
تمہارے ہاتھ پہ یہ سرخ رنگ کیسا ہے

ابھر گئے میری تخئیل سے بدن کے خطوط
کچھ ایسے لفظوں کا ان کو لباس بخشا ہے

وہ میرا حال پریشاں بھی پوچھتے کیونکر
کبھی گھٹاؤں نے صحرا کا حال پوچھا ہے

تمہاری پلکوں کے موتی ہی کیوں چنوں آخر
اسے نہ توڑ لوں وہ جو فلک پہ تارا ہے

بھی اپنے حقوق کو منوانے کی کوشش کی۔ وہ اس انجمن کے سکریٹری بھی تھے۔

"پیام" مئی ۱۹۳۵ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک کے زمانے میں اپنی فضا اور اپنا ماحول پیدا کر چکا تھا۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے دیسی اور بدیسی خبروں کی فراہمی کے علاوہ ریاستی، ہندوستانی اور بین اقوامی مسائل پر اداریے اور تبصرے شائع کئے جانے لگے اور تشنۂ زبان ادب کے لئے قاضی صاحب کی تحریریں سرمایہ بیش بہا تھیں۔ مسلسل کالموں کے ذریعہ پیام نے اپنے چاہنے والوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ وہ بھی جو "پیام" کی پالیسی سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے قاضی صاحب کی طرز نگارش پر مرتے تھے اس لئے "پیام" پڑھتے تھے۔

۱۹۴۶ء کے اواخر میں حیدرآباد کی سیاسی زندگی نے ایک خوشگوار کروٹ لی، مطلع صاف ہوا اور سیاسی افق پر کچھ نظر آئی لیکن یہ تبدیلی مستقل اختیار نہ کر سکی اور بہت جلد آلودہ حصیاں ہو گیا اور مینہ برسا بھی تو ایسا برسا کہ جس نے خاشاک کے ساتھ ایوانوں کے در و دیوار بھی ہل گئے۔ شہر نا درستہ سے ایک تباہی بچ گئی۔ ان آنے والی تباہیوں کا قاضی صاحب کو اندازہ تھا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ حکومت اعتدال پسند پالیسی اختیار کریں۔ خوشگوار تبدیلی یہ آئی کہ نواب علی جنگ کے بننے سے پہلے سر مرزا اسمٰعیل کو ریاست حیدرآباد کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اسی زمانہ میں مرزا اسمٰعیل کی ایما پر قاضی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کو چھوڑ کر عہدہ داری کو قبول کر لیا۔ پھر بھی ان کا تعلق عوام ہی سے تھا کیونکہ وہ اب محکمہ تعلقات عامہ کے ناظم بنا دئے گئے تھے۔ یہ سب فروری ۱۹۴۷ء کی باتیں ہیں۔ اس زمانہ میں استاد گرامی جناب اختر حسن صاحب ورنگل کالج میں بحیثیت استاد اردو فارسی کام کرتے تھے۔ قاضی صاحب کے تحت اختر صاحب کو ۱۹۳۹ء میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں قاضی صاحب کے دل میں اختر صاحب کا ایک مقام پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جب وہ "پیام" کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے تھے تو اختر صاحب کا خیال آیا۔ انہیں خط لکھا گیا اور قاضی صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ "پیام" کو سنبھالیں۔ چنانچہ اختر صاحب نے ملازمت کو ٹھکرا کر صحافت کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھا جہاں سانپ بھی ہیں اور بچھو بھی خود ہی جلوہ فرماتے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں۔ ورنگل سے آکر اختر صاحب نے خواہش کی کہ وہ "پیام" کو ان کے حوالے کر دیں چنانچہ اختر صاحب کے بیان کے مطابق یونس سلیم صاحب (موجودہ نائب وزیر) نے درمیانی شخصیت کی حیثیت سے کاروباری معاملہ طے کرایا۔ تین دن کی "غیر حاضری" کے بعد ۱۴ فروری ۱۹۴۷ء کو "پیام" کا پھر آغاز ہوا۔

دو شنبہ ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء کا اخبار قاضی عبدالغفار صاحب کی ادارت سے نکلنے والا آخری شمارہ تھا۔ چنانچہ صفحۂ اول پر "قارئین پیام سے" کے زیر عنوان انہیں نئی تبدیلیوں سے باخبر کیا گیا۔

> "پیام" کے نظم و نسق میں چند خاص تبدیلیاں ہو رہی ہیں، جن کے پیش نظر ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ فروری ۱۳۵۶ف کو "پیام" شائع نہیں ہو سکے گا۔
>
> ہم قارئین پیام سے توقع رکھتے ہیں کہ ان تین دنوں کی غیر حاضری کو نظر انداز فرماتے ہوئے "پیام" کے اس خاص نمبر کا انتظار فرمائیں گے جو ۱۴ فروری ۱۳۵۶ف جمعہ کو پیش کیا جائے گا اور یہیں اشاعت "پیام" کے نئے دور کا سر آغاز ہوگی۔
>
> براہ کرم چند شہر میں نوٹ فرمالیں (مہتمم "پیام")

چنانچہ تین دن کی "غیر حاضری" کے بعد ۱۴ فروری ۱۹۴۷ء کو جو اخبار شائع ہوا اس اخبار پر اختر حسن کا نام بحیثیت ایڈیٹر تھا جبکہ اسی اخبار کے صفحۂ اول پر قاضی صاحب کا مضمون "ترقی پسند مصنفین" بھی شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار کوئی ۱۲ صفحات پر مشتمل تھا اور جس میں قاضی صاحب کے علاوہ ظفر جاوید اور جمیل الرحمٰن کے مضامین بھی شامل تھے۔ "آغاز" کے زیر عنوان اختر حسن صاحب نے اداراتی نوٹ قلمبند کیا تھا جس میں انہوں نے قاضی صاحب کی خدمات کی ستائش اور مستقبل میں "پیام" کی پالیسی کو بھی واضح کیا ہے۔

> "قاضی عبدالغفار صاحب نے نظامت اطلاعات عامہ کے عہدہ کو قبول کر لیا۔ یہ خبر قاضی صاحب کے نیازمندوں میں تعجب اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سنی گئی۔
>
> . . . .
>
> قاضی صاحب نے مئی ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ پچھلے (۱۲) سال کا زمانہ حیدرآباد کی قومی اور سیاسی زندگی کا بڑا ہنگامہ خیز زمانہ رہا ہے۔ اس دور میں پیام نے اپنے بے خوف تیز و تند مسلک اور اپنی آزادئ فکر اور بے باکی و صداقت سے ایک ایسا مستحکم قلعہ تعمیر کیا جس کے در و دیوار پر قومی و ملکی مسائل کے ایسے ہزاروں نقش و نگار ثبت ہیں جس سے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

انیس انور

مکتوب لندن

ریڈیو شیفیلڈ سے پہلا اردو پروگرام

ریڈیو شیفیلڈ کی ہوم سروس نے ہفتہ وار اردو پروگرام ۱۸ رمئی سے شروع کر دیا ہے۔ اب یہ پروگرام ہر سنیچر کی شام کو سوا چھ سے ساڑھے چھ بجے تک سنا جا سکے گا۔ ۱۸ رمئی کے افتتاحی پروگرام میں شیفیلڈ کے لارڈ میئر اور پاکستانی ہائی کمشنر دہلوی صاحب کے پیغامات نشر کئے گئے۔ اس کے ساتھ اس اردو پروگرام کے مقاصد کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ بعد ازاں دو فلمی گیت پیش کئے گئے اور آخر میں خبریں سنائی گئیں۔

آئندہ ہفتہ دوسرے پروگرام میں مس ممتاز بٹ کا انٹرویو نشر ہوگا جس میں نسلی تعلقات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ پروگرام ۲۰۶۸ میٹر پر نشر ہو رہا ہے۔

برل رہنما جیرمی تھورپ کا مشرق کو مراسلہ

"بحیثیت ایک برل کے میں انسانوں کے مابین برادرانہ تعلقات کے فروغ پر یقین رکھتا ہوں لیکن باہم ہمہ میں نسل انسانی کی رنگا رنگی کا بھی قدردان ہوں۔ لہٰذا اردو داں طبقہ کی برطانیہ میں مستقل سکونت کی مساعی کو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اس طبقہ کا اپنے تہذیبی ورثہ کے تحفظ اور نشو ونما کے لئے یقین کامل سے جدوجہد کرنا خوش آئند ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ تمام قومیتوں اور نسلوں میں اخوت، خوش اعتقادی اور باہمی ہمدردی میں اضافہ ہو لیکن قومی انضمام کے معنی تہذیبی یکسانیت کے نہیں ہیں اور نہ ہونے چاہئیں۔ میں آپ کے جریدہ کا متمنی ہوں۔"

مخلص جیرمی تھورپ

(انگریزی سے براہ راست ترجمہ از انیس انور)

نذر غالب
از انیس انور

دہر میں زیست ہے آزار کہوں یا نہ کہوں!
خود مسیحا بھی ہے بیمار کہوں یا نہ کہوں!
کہنا چاہوں بھی تو وہ بات کہی نہ جائے
ہے اسی بات پہ اصرار کہوں یا نہ کہوں!
عکس خورشید ہو یا پرتو مہتاب و نجوم
ان سے بہتر ہے رخ یار کہوں یا نہ کہوں!
زلف امروز بھی، کاکل فردا جیسے
خواب دیکھا ہے یہ اک بار کہوں یا نہ کہوں!
کون کہتا ہے فراعین جہاں ختم ہوئے
کیوں؟ ہے یوسف سر بازار کہوں یا نہ کہوں!
قرب ساقی و ساغر ہے لب دار بھی ہے
دل ہے کس شے کا طلبگار کہوں یا نہ کہوں!
ڈرتا ہوں عام نہ ہو میرے جنوں کا چرچا
گوش بر آواز ہے دیوار کہوں یا نہ کہوں!
راز دل اس کو سناؤں تو سناؤں کیسے
ہے وہی واقف اسرار کہوں یا نہ کہوں

مراسلات

یونی ورسٹیوں کا اردو نصاب

میرا مضمون کے زیر عنوان ہماری زبان کے ۸ رمئی کے شمارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بھارت میں اردو کے معیار کو بلند رکھنے کے لئے سب سے پہلے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ بھارت کی تمام یونیورسٹیوں کا اردو نصاب یکساں ہو۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو نصابی کتب کی نایابی دکمیابی دور ہو جائے گی۔ چھاپنے اور فروخت کرنے والے بھی فائدہ میں رہیں گے۔ نصاب کا بلند معیار قائم رکھا جا سکے گا۔

آج کل یونیورسٹیوں سے منظور شدہ اردو کتب کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اور یہی بات فارسی اور عربی شعبوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے جو فارسی نصابی کتب منظور کی گئیں ہیں ان کی لکھائی چھپائی انتہائی خراب ہے، کاغذ بہت معمولی استعمال کیا گیا ہے۔ کیا نصابی کتب کا جاذب نظر ہونا ضروری نہیں ہے؟ (عبدالمجید بانگل)

میر کی قبر

میر تقی میر جو دنیائے ادب کے درخشاں ستارے ہیں۔ ان کی آخری آرام گاہ کو جائے نجاست بنا دیا گیا ہے، یہ قابل افسوس امر ہے۔ کون ایسا ادب دوست ہے جو اس افسوسناک اور اندوہناک خبر کو سن کر کف افسوس نہ ملے گا اس کا دل خون کے آنسو نہ روئے گا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ میر جن کے کلام کو لوگ سینہ سے لگا کر رکھتے ہیں، جن کی شیریں بیانی پر دل تھام لیتے ہیں اور زمئی کلام پر سر دھنتے ہیں اور ان کی علم دانی کی قدر کرتے ہیں۔ زمانہ کے ہر دور میں لوگوں نے ان کو سراہا ہے خواہ غالب و ذوق کا زمانہ ہو یا حسرت و فانی کا۔ گویا کہ صرف ان کے ہمعصر ہی گلشن شاعری کو ان کی عطا کردہ روشنی سے منور کرتے رہے بلکہ جیوں جیوں زمانہ بوڑھا ہوتا گیا، میر کے کلام کی روشنی گردش زمانہ کی زد میں آکر اور بھی روشن ہوتی گئی اور نئی نسلوں کو آگے بڑھنے میں مشعل راہ کا کام دیتی رہی ہے اور دیتی رہے گی۔

میرے فاضل دوست عثمانی صاحب کا یہ لکھنا بجا ہے کہ "یہ سب اردو دوستوں کی بے حسی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے" لیکن وہ خود بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو آج تک ان کی خاموشی کیا معنی رکھتی ہے؟ اس کا کیا سبب ہے؟ کیا وہ اس سوال کو اس وقت نہیں اٹھا سکتے تھے جب کہ قبر صحیح حالت میں موجود تھی؟ اگر وہ بغور اپنا جائزہ لیں تو شاید انہیں اپنی غفلت اور غلطی کا احساس ہو جائے اور جب انہیں اپنے تغافل کا احساس ہو جائے گا تو شاید وہ خود کو کبھی معاف نہ کر سکیں گے۔ شاید اس بات سے کسی کو انکار نہ ہو کہ مزار کی اس خراب حالت کی ذمہ داری عثمانی صاحب کی غفلت پر بہت زیادہ عاید ہوتی ہے۔

یوں تو کسی چیز کو کسی سے منسوب کر دینا ایک آسان سی بات ہے مگر ٹھوس ثبوت کے ساتھ معلومات بہم پہنچانا ایک دشوار کن مرحلہ ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ عثمانی صاحب کی فراہم کردہ اطلاع غلط ہے بلکہ میں اس نکتہ پر آرہا ہوں کہ کسی بات کے پیچھے ایک ایسا پس منظر مزید ہوتا ہے جو اس کی صداقت کا ضامن ہوتا ہے۔ کیا عثمانی صاحب کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہے؟ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ قبر میر ہی کی ہے؟ کیا وہ اپنے بیان کی تائید میں کوئی دلیل یا دلائل رکھتے ہیں؟ یا ان کی اطلاع سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے؟ کیا اس موضوع پر وہ تفصیلی بیان دینا گوارا کریں گے؟

آخر میں انجمن ترقی اردو (ہند) سے میں گذارش کروں گا کہ وہ اس بات کی تحقیق کرے کہ آیا وہ میر صاحب کی صحیح معنوں میں قبر ہے یا عثمانی صاحب سے سہو ہو گیا ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے کہ میر صاحب کا مزار مبارک ہے تو انجمن اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور قبر کو اصلی حالت نیز یادگاری شکل دینے کی سعی کرے۔ اگر دوسرے اخراجات کے سبب انجمن کے لئے یہ ممکن نہ ہو تو انجمن کو چاہیے کہ اس کام کے لئے فنڈ کھولے اور زیادہ سے زیادہ چندہ وصول کرکے اچھی سے اچھی شکل میں میر و ذوق کی قبروں کو ایسی یادگاری شکل دیدے جو ان کے شایان شان ہو۔

علاوہ ازیں میں اردو دوستوں سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ رقم دے کر انجمن کے ہاتھ مضبوط کریں۔ تاکہ انجمن ان مزاروں کی حفاظت بخوبی کر سکے۔ یہ صرف ایک میر کا معاملہ نہیں بلکہ نہ جانے کتنی ایسی شخصیتیں غلاظت کے انبار تلے دبی ہوئی ہیں۔ جن کے خزینہ سے دنیا آج بھی مستفید ہو رہی ہے۔ (ایم۔ اے ظفر)

(میر کی قبر کے سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا بیان زیادہ مستند ہو سکتا ہے۔ (ادارہ ہماری زبان)

شیو ناتھ پرشاد اترپردیش انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب

لکھنؤ۔ ریاستی انجمن ترقی اردو (لکھنؤ) کے عہدہ داروں کا نیا انتخاب متفقہ طور پر ہوا۔ ریاستی انجمن کا یہ انتخابی جلسہ سنٹرل ہوٹل امین آباد میں پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں ہوا۔ نئے عہدہ دار یہ ہیں۔

پروفیسر شیو ناتھ پرشاد (بنارس) صدر، قاضی عدیل عباسی ایڈوکیٹ (بستی)، بیگم سلطانہ حیات (لکھنؤ)، جناب وفا الرحمان جامی (رام پور)، جناب ریاض الرحمان شیروانی (علی گڑھ) نائبین صدر، سکریٹری راحت علی خاں (زمان پارہ)، خازن جناب حیات اللہ انصاری۔ جوائنٹ سکریٹریوں کے نام کا مسئلہ ملتوی کر دیا گیا۔ مجلس عاملہ کے عہدہ داروں کے نام یہ ہیں۔

جناب قاضی مختار احمد (کانپور)، جناب داتا رسول (بنارس)، مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی (لکھنؤ) مولانا عطا محسن زکاکوروی، حکیم ابوالکلام (گورکھپور) مولانا حکیم اشو (بلیدوانی)، جناب دگمبیر سرن دیواکر راہی (رامپور)، مولانا ابوالبیان (شمس آباد)، حکیم عبدالخالق (سہارنپور) جناب ظہور احمد (سہارنپور)، جناب محمد فاضل (متھرا)، جناب احمد ابراہیم علوی (لکھنؤ)، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ)، جناب ریاض الدین احمد (الہ آباد)، جناب بدرالحسن (پیلی بھیت)، جناب عاشق حورالوی (کانپور)۔

چار ممبروں کو مجلس عاملہ میں صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نامزد کریں گے۔

صبح پرانی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں سابقہ کارروائی کا جائزہ لیتے ہوئے ریاستی انجمن کو سرگرم بنانے پر غور کیا گیا بحث میں صدر جلسہ پنڈت آنند نرائن ملا ایم پی۔ جناب حیات اللہ انصاری ایم۔ پی۔ مولانا ہاشم میاں فرنگی محل۔ جناب وفا الرحمان جامی اور جناب احمد ابراہیم علوی نے حصہ لیا۔

قاضی مختار احمد نے بہ حیثیت سکریٹری رپورٹ پیش کی۔ اور جلسہ نے آمد و خرچ کا گوشوارہ منظور کیا۔

جلسہ یوم اردو میں معتمد انجمن شاخ آندھرا کا خطبہ استقبالیہ

حیدرآباد۔ ۳۱ رمئی کو سارے آندھرا پردیش میں یوم اردو منایا گیا ذیل میں انجمن کی شاخ آندھرا کے معتمد جناب حبیب الحق صاحب کی استقبالیہ تقریر درج کی جا رہی ہے جو موصوف نے حیدرآباد میں جلسہ یوم اردو کے موقع پر کی۔

جناب صدر، خواتین و حضرات: میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے انجمن ترقی اردو کی دعوت پر آج اس جلسے میں شریک ہونے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ میں خصوصیت سے ممنون ہوں جناب ایم نرسنگ راؤ صاحب کا کہ آپ نے بڑی فراخ دلی سے بلا تامل ہمارے جلسے کی صدارت قبول فرمائی۔ میں انجمن کی طرف سے آپ سب کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔

خواتین و حضرات: مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ آندھرا پردیش میں اردو کے تعلق سے ہمیں پھر احتجاج کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تقریباً ڈھائی سال پہلے جب لیجسلیٹو اسمبلی میں سرکاری زبان کا مسودہ قانون پیش ہوا تھا تو اس میں اردو کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہ تھا اس پر ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے آندھرا پردیش کے اکثر مقامات پر احتجاجی جلسے منعقد کئے گئے تھے جن میں ہمارے تلگو بولنے والے بھائیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور دل کھول کر ہمارے اس مطالبے کی تائید کی تھی کہ مسودۂ قانون میں اردو کے لئے بھی مناسب جگہ رکھی جائے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو کا ایک وفد بھی چیف منسٹر سے ملا تھا اس احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون سرکاری زبان میں اردو کے تعلق سے ایک دفعہ شامل تو کی گئی لیکن کچھ اس ڈھنگ سے کہ اردو والے اس سے غیر مطمئن ہی رہے۔ دفعہ حسب ذیل ہے۔

"ریاستی حکومت وقتاً فوقتاً آندھرا پردیش گزٹ میں اعلامیے جاری کر کے تلگو زبان کے علاوہ اردو یا کسی اور زبان کے استعمال کے بارے میں اس زبان یا زبانوں کے بولنے والوں کے مفادات کی خاطر ان علاقوں کے لئے سرکاری مقاصد اور معینہ مدت کے لئے جن کی صراحت اعلامیہ میں کی گئی ہو ہدایت جاری کر سکتی ہے۔"

اردو زبان کی اہمیت کو گھٹانے اور اس کے مستقبل کو غیر یقینی بنانے کے لئے اس دفعہ میں جو کوشش کی گئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ قانون سرکاری زبان میں اردو کے لئے جو تھوڑی بہت گنجائش فراہم کی گئی ہے وہ خوش دلی سے نہیں بلکہ بدرجہ مجبوری کی گئی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس ناقص دفعہ کو بھی روبہ عمل لانے میں غیر معمولی تاخیر ہوتی جا رہی ہے۔ دو سال گزر گئے لیکن ابھی تک سوائے ایک بہت ہی مختصر اعلان کے اردو کے بنیادی حقوق کو محفوظ کرنے کے لئے کوئی اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا۔ اس حالت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے انجمن کا ایک وفد گذشتہ ستمبر میں پھر ایک بار چیف منسٹر سے ملا اور موصوف نے ہمیں

یقین دلایا کہ وزیر متعلقہ اس سلسلے میں جلد کوئی اقدام کریں گے آٹھ مہینے گزر گئے لیکن ہنوز وہی روز اول ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ہمارا فرض کیا ہے

پہلی ضرورت تو اردو کا پھیلاؤ اور تقریباً ہر ریاست میں اردو بولنے والوں کی موجودگی نیز مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اردو کا رواج ایسے عوامل ہیں جو اردو کو مٹنے نہیں دیں گے بشرطیکہ خود اردو بولنے والے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اس غرض کے لئے جس ایثار کی ضرورت ہے اس سے دریغ نہ کریں۔ ایک طرف تو وہ اپنی اولاد کو کسی حالت میں بھی اردو سے محروم نہ ہونے دیں۔ خواہ اسکولوں میں اردو کا انتظام ہو یا نہ ہو وہ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر گھروں پر اردو پڑھانے سے غفلت نہ برتیں، دوسری طرف وہ ریاستی حکومتوں سے اردو کا حق منوانے کی کوششیں برابر جاری رکھیں۔ آندھرا پردیش کے اردو بولنے والوں سے میری یہ التجا ہے کہ وہ اپنی جد و جہد کو اب اور زیادہ تیز کردیں۔ خاص کر اس وجہ سے بھی کہ جس خطہ ملک میں وہ آباد ہیں۔ وہاں اردو کو ہمیشہ ایک خصوصی اور اہم موقف حاصل رہا ہے وہ کم و بیش ایک صدی تک سابق ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان رہی ہے۔ ریاست کے تینوں علاقوں تلنگانہ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے درمیان اس نے مدتوں تک بڑی خوبی سے رابطہ کی زبان کا فرض انجام دیا ہے ریاست حیدرآباد ہی نے برطانوی حکمرانوں کی مخالفت کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی قائم کرکے ہندوستان کی ایک زبان اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دینے کی ہمت کی تھی جس کو رابندر ناتھ ٹیگور اور سروجنی دیوی جیسے قومی مشاہیر نے سراہا۔

بہر حال ہم آندھرا پردیش کے اردو بولنے والے اپنے ان مطالبات کی طرف جو ہم پچھلے کئی برسوں سے پیش کرتے آرہے ہیں ایک مرتبہ پھر ریاستی حکومت کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ آندھرا پردیش میں بسنے والوں کی ایک بھاری تعداد اردو بولتی ہے اور وہ آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کی مادری زبان ہے اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔

(۲) ان علاقوں میں جہاں آبادی کا کم از کم ۱۰ فی صدی حصہ اردو بولتا ہے حسب ذیل سہولتیں فراہم کی جائیں۔

الف۔ اہم قوانین، قاعدے، ضابطے، اور اعلامیے۔ محصول، قیمت والے دیہتگان برقی اور آب رسانی کے بل راشن کارڈ وغیرہ اردو میں بھی جاری کئے جائیں۔

ب۔ وکلاء کو عدالتوں میں اردو کے استعمال کی اجازت ہو اور عرضی دعوے، درخواستیں، مرافعے، حلف نامے وغیرہ اردو میں بھی قبول کئے جائیں۔ اگر فریقین فیصلے اور کے اردو ترجموں کا مطالبہ کریں تو انہیں مہیا کئے جائیں۔

ج۔ ضلع پریشدوں، پنچایت سمیتوں اور لوکل باڈیز میں اس کا انتظام کیا جائے کہ اگر کوئی رکن اردو میں تقریر کرے تو اس کاروائی کا ریکارڈ اردو میں بھی رکھا جائے۔

د۔ تعلقہ اور ضلع کے دفتروں میں اردو بولنے والے اہل معاملہ کے لئے پوری پوری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

ہ۔ داخلہ کے موقع پر دس طلبہ کی وقت واحد میں موجودگی پر اصرار کئے بغیر جو بعض اوقات ناقابل عمل ہو جاتی ہے تحتانی اور ثانوی مدارس میں اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کا انتظام کیا جائے۔ اردو اساتذہ کی ٹریننگ اور اردو نصابی کتب کی طباعت کا بھی انتظام کیا جائے۔

و۔ تمام سرکاری عمارتوں کے سائن بورڈوں پر اردو میں بھی ان کے نام لکھے جائیں۔

(۳) مختلف سرکاری ملازمتوں میں تقرر کے اغراض کے لئے اردو کو بھی استعمال کیا جائے۔

(۴) ایوان مقننہ میں پیش ہونے والے مسودہ قانون منظور کردہ قوانین اور گورنر کے آرڈیننس کے لئے اردو بھی استعمال کی جائے۔ ریاستی سرکار کی طرف سے جاری ہونے والے تمام احکام، قوانین، ضابطے اور ذیلی قوانین وغیرہ اردو میں بھی ہوں۔ مقننہ کے اراکین کو اردو میں تقریر اور سوالات کرنے کی آزادی حاصل رہے اور ان کے جوابات بھی اردو میں دیئے جائیں۔ مقننہ کی کاروائیوں کی رودادیں اور حکومت کے گزٹ اردو میں بھی شائع ہوں۔ ہمارا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ اردو کے ان واجبی حقوق کو بلا کسی مزید تاخیر کے قانونی تحفظ عطا کیا جائے۔

جناب صدر۔ ابھی ہم اپنے ان حقوق کو حاصل کرنے کی جد و جہد ہی میں لگے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے ایک اور نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے اور وہ ہے سہ لسانی فارمولے کا مسئلہ ابھی کوئی تین مہینے قبل آندھرا پردیش لیجسلیٹو اسمبلی نے اس بارے میں ایک قرار داد منظور کی ہے جس میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ غیر ہندی ریاستوں کی حد تک سہ لسانی فارمولا میں یہ تین زبانیں شامل ہوں مادری زبان، ہندی اور انگریزی۔ آندھرا پردیش کے اردو بولنے والے بچوں کو اس فارمولے کے مطابق اپنی مادری زبان اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی لازمی طور پر سیکھنا پڑے گا لیکن اس فارمولے کے مرتب کرنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس پر عمل کرنے سے ہمارے بچے تلگو زبان سے محروم ہو جائیں گے جو ان کے لئے انگریزی اور ہندی دونوں سے زیادہ اہم ہے

اور اگر وہ تلگو بھی سیکھنا چاہیں گے تو یہ سہ لسانی فارمولا ان کے حق میں چار لسانی فارمولا بن جائے گا۔ اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے چند روز پہلے اردو ہال میں اردو کا کام کرنے والوں کا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں مشورے کے بعد متفقہ طور پر طے ہوا کہ اردو بولنے والے بچوں کو سب سے پہلے تو ان کی مادری زبان اردو سکھائی جائے اور اس کے بعد انھیں لازمی طور پر اس ریاست کی اکثریتی زبان تلگو پڑھائی جائے اور جہاں تک تیسری زبان کا تعلق ہے انھیں اختیار دیا جائے کہ وہ انگریزی اور ہندی میں سے اپنی مرضی کے مطابق کوئی ایک زبان سیکھیں۔ اس طرح سہ لسانی فارمولے کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور ساتھ ہی کسی بچے پر بلا وجہ چار زبانیں سیکھنے کا بار بھی نہیں پڑے گا۔ ابھی کچھ دن ہوئے ہم نے اس بارے میں ایک یادداشت آندھرا پردیش کے وزیر تعلیم کی خدمت میں پیش کی ہے اور ان کے جواب کے منتظر ہیں۔ میں آندھرا پردیش کے ارباب اقتدار سے ایک مخلصانہ گزارش اور کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اردو بولنے والے گزشتہ کئی سال سے اپنی زبان کے تحفظ کے لئے پے درپے حکومت سے نمائندگیاں کرتے آرہے ہیں۔ اس اثناء میں ہم نے کئی یادداشتیں پیش کی ہیں دو ایک مرتبہ کل ریاستی بنیاد پر احتجاجی جلسے بھی منعقد کئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہماری اس جدوجہد کا یہاں کے صاحبان اقتدار پر کچھ اثر بھی ہوا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ہماری یہ ساری جدوجہد نتائج کے اعتبار سے کامیاب نہیں کہی جاسکتی۔ میری تمنا ہے کہ شور و غل، نعرے بازی، ہنگامہ آرائی، مرن برت اور تشدد آمیز حرکات کے بغیر ہی اردو کو آندھرا پردیش میں اس کا جائز حق مل جائے۔

انجمن ترقی اردو سری نگر کا انتخاب

انجمن ترقی اردو کشمیر، سری نگر کے مندرجہ ذیل عہدیداران منتخب ہوئے۔

شمیم احمد شمیم صدر، میر غلام رسول نازکی، نائب صدر، محمد یوسف ٹینگ سکریٹری، پشکر ناتھ، جائنٹ سکریٹری، ایم۔ ایچ۔ رضوی، خزانچی۔

حسب ذیل ممبران بھی منتخب ہوئے۔

پروفیسر عبد القادر سروری، حبیب اللہ حامدی، ڈاکٹر شکیل الرحمان، غلام محمد بادن، ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو، نور شاہ، نند لال کول طالب، تنویر قلندر، مظفر عازم، پیج بہادر بھان، میرزا کمال الدین شیدا، محمد عبد اللہ شیدا۔ انجمن کی طرف سے اس ماہ میں "یادگار غالب" کے عنوان سے ایک تقریب منعقد کی جائے گی۔

ایک تصحیح — "جدید ہندی اور اردو ادب میں ترقی پسند رجحانات" کے عنوان سے جو خبر ہماری زبان کے یکم جون کے شمارے میں شائع ہوئی تھی وہ مضمون ایک کنوینر جناب کنور پال سنگھ نے پیش کی تھی۔ کاتب کی غلطی سے ان کا نام نہ دیا جاسکا۔

(ادارہ ہماری زبان)

صفحہ ۲ سے آگے

آئندہ مورخ نہ جانے اس کے متعلق کے کتنے خاکے تیار کرے گا۔

پیام کی پالیسی — اکثر احباب مجھ سے ملنے والوں نے یہ دلچسپ سوال کیا کہ اب پیام کی پالیسی کیا رہے گی؟ ...... اس امر کا یقین دلانا ہمارا فرض ہے کہ کسی فرد یا جماعت کی دل آزاری اور تحریر تنقید و تنقیص سے پیام کا دامن انشاء اللہ کبھی داغدار نہ ہونے پائے گا۔ صحافت کا شریفانہ پیشہ جن اعلیٰ اور مستحسن اصول اور طریقوں کا متقاضی ہے پیام اس سے انحراف نہ کرے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اختر حسن صاحب نے جن باتوں کا دعویٰ کیا وہ کر دکھایا لیکن صحافت کا شریفانہ پیشہ ان کی شریفانہ پالیسی اور شریفانہ تحریر سے کفر سے عبر گیا۔ انھوں نے اپنی وسیع النظری اور فراخدلی سے صحافت کے سر کو اونچا کیا ہے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء کے دوران پیام "کو مختلف دشواریوں سے گزرنا پڑا، دفتر لوٹ لیا گیا، ایڈیٹر کو قتل کی دھمکی دی گئی، شورشیں سر اٹھائیں اور جھنکاریں رہیں لیکن پیام" کی بیباکانہ روی میں فرق نہ آیا۔ اس دور میں صحافت کے سر پر بندوق تک رہی تھی۔ ایک قتل بھی ہوا جس نے شہید صحافت شعیب اللہ خاں (ایڈیٹر امروز) کا قتل ہوا اس دن "پیام" کے دفتر پر حملہ بھی ہوا تھا اور ایڈیٹر کو وہاں نہ پاکر دفتر میں تباہی مچائی گئی تھی۔ اور پھر اس کے بعد احتساب بھی عائد ہوا اور لاٹھی بھی دی گئی لیکن "پیام" نے اپنی خو نہ بدلی۔ "پیام" شروع سے آخر تک قوم پرست اخبار تھا اور اگر وہ "ترقی پسند" تھا بھی تو نظریہ کی بنیاد پر ہم اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرسکتے ہیں لیکن بڑی بات یہ تھی کہ وہ جوش و جذبہ کے اندھے کنوئیں میں غوطہ زن نہیں تھا یہی اس اخبار کی امتیازی شان تھی۔ اور اسی وجہ سے عوام "پیام" کے گرد جمع ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء کی پولیس کارروائی کے بعد یہاں طرح طرح کے ذہن بنے اس دور میں اختر صاحب کے بیان کے مطابق اس اخبار کی اشاعت (۱۵) ہزار کے لگ بھگ پہنچ گئی تھی۔ پولیس کارروائی کے زمانہ میں امن کمیٹیاں قائم کی گئیں اور بحالی امن کا اہم کام انجام دیا گیا۔ اور "پیام" کے ذریعہ بھی امن و امان کی بحالی کے لئے آواز اٹھائی گئی۔

۱۹۴۸ء کی تبدیلیوں کے بعد اختر حسن صاحب نے عملی سیاست میں حصہ لیا اور پہلے انتخاب میں وہ رکن اسمبلی منتخب بھی ہو گئے لیکن دوسرے انتخاب میں شکست اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر ۱۹۵۰ء میں "پیام" بند کر دیا گیا۔ اس طرح حیدرآباد کی صحافتی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہوا۔

آل احمد سرور

میرا صفحہ

اردو دنیا شاید اُماشنکر جوشی سے واقف نہ ہو، مگر یہ گجراتی زبان کے نہایت ممتاز شاعر اور نقاد ہیں۔ حال میں انھیں کنڑ کے مشہور شاعر پُٹّپا کے ساتھ گیان پیٹھ کا انعام ملا ہے جو تخلیقی ادب پر دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ملیالم شاعر شنکر کروپ اور بنگالی ناول نگار تاراشنکر بنرجی کو یہ انعام مل چکا ہے۔ اُماشنکر جوشی سے میری ملاقات سب سے پہلے ساہتیہ اکاڈمی کی کونسل کے ایک جلسے میں ہوئی۔ اس زمانے میں وہ امریکہ سے واپس آئے تھے جہاں وہ جنرل ایجوکیشن کے سلسلے میں امریکہ میں کام کی رفتار کا مطالعہ کرنے ہندوستان کی کچھ اور یونیورسٹیوں کے استادوں کے ساتھ گئے تھے۔ اس وفد میں علی گڑھ کے میرے ایک رفیق بھی تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے اس رفیق کی خیریت دریافت کی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے جن سے اندازہ ہوا کہ اُماشنکر جوشی گجراتی کے ممتاز شاعر اور ادیب اور نقاد ہی نہیں، انگریزی ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ میری ایک اور رفیق ڈاکٹر ثریا سلطانہ کے شوہر ڈاکٹر افتخار حسین کچھ عرصے احمد آباد میں رہے۔ اُماشنکر جوشی سے ان دونوں کا خاص ربط و ضبط ہو گیا تھا اور ہر ملاقات میں مجھ سے ان کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ جوشی رفتہ رفتہ گجرات یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ ان کی کچھ گجراتی نظموں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اب یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ احمد آباد سے جو رسالہ نکلتے ہیں اس کا ایک خاص نمبر جوشی کے مرتبہ کے لیے وقف ہوگا۔ یہ تراجم کا روکھیولا کرتے ہیں جو کئی ہفتے جوشی کے ساتھ قیام کر چکے ہیں۔ جوشی انسان دوست آدمی ہیں۔ گاندھی اور نہرو سے گہری عقیدت رکھتے ہیں اور سیکولرزم کے حامی ہیں۔ اردو سے بھی انھیں دلچسپی ہے۔

ضرورت ہے کہ اردو میں جوشی اور گجرات کے دوسرے ممتاز شعراء کے کلام کا ترجمہ شائع ہو۔ بنگالی، پنجابی اور ہندی کے شعراء کے کلام کے ترجمے ہمارے رسالوں میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کے ممتاز شعراء کے کلام کا ترجمہ اردو میں ضرور ہونا چاہیے۔ گجرات کے اردو ادیب اس طرف توجہ کریں تو اس کمی کو جلد دور کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مہاراشٹر کے اردو ادیب مرہٹی کے شعراء کے تراجم میں مدد دے سکتے ہیں، حیدرآباد کے تلگو شعراء کے، میسور کے کنڑ شعراء کے اور مدراس کے تامل شعراء کے۔ ظاہر ہے کہ تراجم کلاسیکل شعراء اور جدید دور کے ممتاز شعراء دونوں کے ہونے چاہئیں۔

ہماری نئی نسل شاید فاروق دیوانہ گورکھپوری کا نام بھی نہ جانتی ہو، لیکن جو لوگ مولانا محمد علی کے ہمدرد کا مطالعہ کر چکے ہیں یا جن کا تعلق ایم۔ اے۔ او کالج سے یا ۱۹۳۰ء تک کے علی گڑھ سے رہا ہے یا جو مشرقی یو۔ پی سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہیں، وہ فاروق دیوانہ کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ یہ علی گڑھ کے نہایت ممتاز طالب علم تھے اور بعد میں استاد بھی رہے۔ ریاضی میں غیر معمولی صلاحیت کے علاوہ عربی، فارسی، اردو ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اردو کے مشہور ادیب اور نقاد مجنوں گورکھپوری انھیں کے صاحبزادے ہیں۔ مجنوں نے اپنا تخلص باپ کے تخلص کی رعایت سے ہی رکھا تھا۔ رشید صاحب کے مضامین میں جن حاجی بلیغ العلیٰ کا تذکرہ آتا ہے ان سے مراد یہی فاروق دیوانہ ہیں۔ کچھ دن ہمدرد میں کام کیا۔ پھر علی گڑھ میں ریاضی پڑھانے لگے۔ یہاں سے رخصت ہوئے تو گورکھپور کے مشہور رئیس میاں صاحب کی جائداد کے منیجر مقرر ہوئے۔ انھوں نے وہاں اپنی ذہانت و قابلیت سے میاں صاحب کے کاروبار کو بڑی وسعت دی۔ کئی سال ایم۔ ایل۔ سی بھی رہے۔ ادھر کئی سال سے زیرِ علاج تھے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ مئی کے دوسرے ہفتے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

فاروق دیوانہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ نہایت دبلے پتلے، منکسر، بلا کے ذہین۔ جب بھی ملاقات ہوئی تو ان کی ذہانت اور علمیت کا مجھ پر گہرا نقش پڑا۔ علی گڑھ نے جو دیوانے پیدا کیے ان میں دیوانہ گورکھپوری کا نام ہمیشہ عزت اور احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

نہ زلفوں کے فدائی ہیں، نہ زنجیروں کے شیدائی
یہ دنیا اب تو دیوانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے (سرور)

محمد طفیل ایڈیٹر نقوش اب خود بھی اپنے کو محمد نقوش کہنے لگے ہیں۔ انھوں نے اردو میں ضخیم نمبروں کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے اسے شاید ہی شکست دی جا سکے۔ پہلے ایک مکاتیب نمبر شائع کر چکے تھے۔ اب تین جلدوں میں دوسرا حصہ پیش کیا ہے۔ اس میں دو ہزار کے قریب خطوط آ گئے ہیں جن میں سرسید اور غالب کے خاصی تعداد میں ایسے خطوط ہیں جو پہلی دفعہ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، امتیاز علی عرشی اور مالک رام کے خطوں سے تحقیق کے آداب اور اسرار و رموز پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ محمد طفیل کا یہ کارنامہ اردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر نصیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا